سنہ ۱۹۴۲ء

کی

منتخب نظمیں

مرتبہ

ادارۂ ادبِ لطیف

مکتبۂ اُردو لاہور

طبع اوّل

قیمت ۱۲ار

گیلانی الیکٹرک پریس میں باہتمام چوہدری نذیر احمد پرنٹر پبلشر چھپکر مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوئی۔

فہرس

پیش لفظ

کسی منتخب مجموعے کے مرتب کو سب سے پہلے جس سوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ اسکی افادیت سے متعلق ہوتا ہے۔ آخر اس انتخاب کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی ؟ اگر اسے تجارتِ محض پر محمول کیا جائے تو مرتب اور ناشر دونوں ایسی ادبی بددیانتی کے مرتکب قرار دیئے جائیں گے جسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جنگ کے اس دور میں جب کاغذ گراں ہی نہیں نایاب ہو چکا ہے۔ ایک ایسے مجموعے کی اشاعت یقیناً ایسے اتہامات سے بالاتر ہے۔ اس لئے ہمیں اس کے جواز کے لئے کوئی دوسری راہ دیکھنا ہوگی۔

ازل سے انسانی زندگی مسرت اور آلام اور اسی نوع کی دوسری کیفیات سے وابستہ رہی ہے۔ آج بھی زندگی انہیں سے مرکب ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گی۔ چنانچہ حیاتِ انسانی کا ایک واضح مطمعِ نظر، تلاشِ سکوں ہے۔ اسی کے لئے انسان ازل سے آج تک سرگرداں رہا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ کا باعث بھی یہی سرگردانی ہے۔ شاعری فنونِ لطیفہ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اور انسانی ذہن کو کیف و سرور کی بلندیوں پر لے جانے کی بیشتر ذمہ دار ہے۔ اس لئے اس کی ضرورت ہر زمانے میں محسوس ہوگی۔ انسان اپنی زندگی کی گوناگوں مصیبتوں سے رہائی پانے کے لئے کبھی تو اُن کی آگ میں کود پڑتا ہے اور اسے گلزارِ خلیل بنا کر چھوڑتا ہے اور کبھی اُن سے بھاگ کر سنتِ موسوی کو پورا کرتا ہے۔ یہ بھاگنے کی کیفیت بھی اُن مترنم رنگوں کی پروردگار ہے جو شاعری کے دامن پر بہت خوشنما نظر آتے ہیں۔ تخیل اور احساس کا جو لطیف امتزاج شاعری میں ملتا ہے وہ شاید فنونِ لطیفہ کی دیگر اصناف میں اتنا بدیہی اور واضح نہیں۔ شاعری زندگی کی عکاس ہے۔ اور یہ عکاسی جب جذبات کی قوس و قزح میں ڈوب کر اُبھرتی ہے۔ تو کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ

نہیں سکتا۔ دوسرے یہ کہ ہر دور کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان اور عکّاس ہونے کی وجہ سے ہمیں اُس کی ذہنی نشو ونما اور حسیاتی بیداری کا آئینہ دکھاتی ہے۔ اس لئے اگر ۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں پیش کرتے ہوئے ہم یہ کہیں کہ آئندہ نسلوں کے لئے ہم اپنے زمانے کی ذہنی اور تاریخی یادگار چھوڑ رہے ہیں۔ تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ یہ ایک چراغ جو آج روشن ہوا ہے آنے والے کاروانوں کو ہمیشہ نظر آتا رہے گا۔ اور اگر ہماری یہ کاوش رنگ لائی تو ایسے ہی چراغوں کی کبھی نہ بجھنے والی قطار فروزاں کی جا سکے گی۔

آج کی شاعری میں اشتراکی اور جمہوری رجحانات جو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بغاوت کا نتیجہ ہیں کے علاوہ انفرادی بے اطمینانی اور اضطراب کی پروردہ تحریکات سرگرم کار ہیں۔ یہ تحریکات انفرادی ہوتے ہوئے بھی ایک مجموعی حیثیت کی مالک بن جاتی ہیں اور شخصی زندگی اجتماعی زندگی کے مترادف نظر آنے لگتی ہے۔ سال ۱۹۴۲ء موجودہ جنگ کا ایک یادگار سال ہے۔ اس سال میں تمام ہندوستان ملکی سیاسیات کی بنا پر پریشان رہا۔ اس سال میں بیرونی حملے کا دھڑکا لگا رہا۔ لوگوں کی نظریں کبھی اپنے گھروں پر اور کبھی اخبارات کے صفحوں پر رہیں۔ جہاں جنگی تیاریوں میں حصہ لیا گیا۔ وہاں اشیاء کی گرانی اور نایابی کے خلاف ایک اور جنگ لڑنا پڑی۔ یہ اور اسی قبیل کے دوسرے حالات ہیں جن کے ماتحت ملک کے شاعر کا تخیل جولاں رہا۔ شاعری اپنے ماحول سے باہر نہیں نکل سکتی چنانچہ ان واقعات کی جھلک ہمارے شعرا کے کلام میں نظر آرہی ہے۔ شاعر قوم کا حساس دل ہے۔ یہی تمام محسوسات کا مرکز ہے اس لئے ملک کی بے چینی کا وار سب سے پہلے شاعر پر پڑا۔ چنانچہ شاعری میں بھی ایسے ہی موضوعات منتخب ہوئے جو اگر سکون اور راحت سے متعلق ہیں تو اس لئے کہ شاعر اپنی موجودہ زندگی سے گریز کرنا چاہتا ہے اور اگر انقلابات روزگار کے ماتحت ہیں تو یہی ہے کہ یہ اُس کی قلبی واردات کا نتیجہ ہیں۔ بات یہیں ختم ہو جاتی۔ سال گذشتہ کی اہم محرکات کے علاوہ یہ حساس دل انسان کے ازلی دکھوں کا مداوا بھی چاہتا ہے۔ رسم ورواج سماج کے جھوٹے بندھن اور وقت کے قواعد و آئین اُس کے لئے ناقابل برداشت ہو چکے ہیں اور وہ اطمینان پیدا کرنے کی کوئی سبیل تراشنا چاہتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اور دوسری یہ کہ موجودہ نظام کی اصلاح کی جائے۔ یہ دونوں صورتیں بھی ہماری نظموں سے پیدا ہیں۔ علاوہ ازیں جب شاعری کی محرک کیفیات بے اطمینانی اور بے چینی سے مرکب ہوں تو واضح ہے کہ اس میں لطیف اور پُرنمک تکلفات کی بجائے سنگین اور آہنی حقائق اور کڑوی کسیلی باتوں کی کھنک سنائی دے گی۔ الفاظ کی ساکن سطح کے نیچے تلواروں

کی جھنکار تیرتی نظر آئے گی اور دبے ہوئے جذبات موجزن دکھائی دیں گے۔ آج ہم ردیف قافیے کی نشست اور محاکاتی اور معاملاتی زبان کے چٹخاروں جو ہمیں اپنی شاعری کی روایات سے منطبق رکھتے ہیں کے ساتھ ساتھ آزاد اور بے قافیہ شاعری کی ہوائی لذت سے محظوظ ہوتے ہیں۔ بغور دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ ہندوستان میں اس شاعری کی ترویج اور نشو و نما موجودہ جنگ کے دوران میں ہوئی ہے جس کی وجہ ہمیں جنگ کے اثرات کے علاوہ کہیں نہیں ملتی چنانچہ پرانے بُت اپنے معبدوں میں پڑے رہ گئے اور پروہتوں نے زنگ آلود کواڑ کھول کر بیرونی دُنیا کا مظاہرہ کرنا گوارا کر لیا۔

اس تمہید کے بعد یہ کہنا لاحاصل نظر آتا ہے کہ ہمارا ادب ایک اضطراری دور سے گذر رہا ہے۔ اس دور کی نمایاں خصوصیات کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کئی ایک خصوصیات جو مکمل اور واضح ہیں۔ ابھی تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتیں اور کئی دوسری خصوصیات تکمیل طلب ہونے کی کوئی وجہ سے ناقابل گرفت ہیں۔ ہم اسے آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑتے ہیں کہ وہ ہمارے چہروں کو کس روشنی میں بے نقاب کرنا چاہیں گی لیکن اگر ہم اس دور کا دامن ہاتھ سے جانے دیں گے تو یقیناً اُردو شاعری کے مستقبل اور اس کی برق رفتاری کا اندازہ لگانے اور جائزہ لینے سے قاصر رہیں گے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہر صاحب نظر کو جہاں روزانہ دنیا بھر کے ہنگاموں اور واقعات کی معلومات سے پوری طرح مسلح ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہاں اپنے ملک کی ادبی سرگرمیوں اور ان کی بدلتی ہوئی صورتوں اور متنوع کیفیات کی نبض شناسی بھی اتنی ہی اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں روزنامہ کی کی زندگی ایک دن، ہفتہ وار اخبارات کی ایک ہفتہ اور ماہناموں کی ایک مہینہ ہوتی ہے۔ وہاں ایک کتاب اپنی حیثیت کے مطابق زندہ رہنے کی مجاز ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ماہنامے جو کل تک تازہ تھے۔ آج ردی کے انبار کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن یہ نظمیں جن کا انتخاب انہیں ماہناموں میں سے ہوا ہے۔ اس قابل نہیں کہ انہیں فروگذاشت کر دیا جائے۔ ان میں سے اکثر نظمیں ایسی ہیں جو ہمیشہ تازہ رہیں گی اور ہر دور اور ہر زمانہ میں پڑھے جانے سے اُنکی بوباس میں کچھ فرق نہ آنے پائے گا۔ کچھ ایسی ہیں کہ جو تجرباتی ہونے کے اعتبار سے سنگِ میل کا کام دیتی ہیں اور جن کے سہارے چل کر شاید بہترین شاعری کی منزلیں قائم کی جا سکیں۔ اس لئے بھی یہ انتخاب نہایت اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم میں سے بیشتر حضرات زندگی کی تگ و دو اور اس کی دیگر مصروفیات کے پیشِ نظر معیاری ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے کیلئے وقت نہیں نکال سکتے۔ اس لئے بھی یہ مجموعہ اُن کے ذوق کی اصلاح اور ان کی ادبی رہنمائی کی اہمیت رکھنے کے باعث مفید ثابت ہو سکتا ہے اور شاید ایسے اصحاب کیلئے کسی غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت

سے اس انتخاب کی اہمیت کہیں زیادہ ہو۔ انگریزی ادب جس کے اثرات کو ہمارے ادب نے اس شدت سے قبول کیا ہے، میں ایسے مجموعے بکثرت ملتے ہیں۔ آپ اسے تقلید کہہ لیجئے، لیکن یہ کورانہ تقلید نہیں۔ ہمیں یقین ہے۔ کہ یہ تقلید اپنے اندر کتنی دُور افتادہ نتائج لئے ہوئے ہے جو ہر صورت میں آئندہ ادبی کارناموں کی تخلیق میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

ہم نے سالِ گذشتہ کے تمام تر رسائل کی پوری طرح چھان پھٹک کے بعد ملک کے اُن شعرا کی چیدہ چیدہ نظموں کا انتخاب کیا ہے جو خود آج کی اُردو شاعری میں منتخب ہیں۔ ان میں آپ کو کئی ایسے حضرات بھی ملینگے جو ادب میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں اور کئی ابھی تک مقام کی تلاش میں ہیں۔ تاہم ہمارا دعوےٰ ہے کہ اس مجموعے میں کوئی نظم ایسی نہیں جو ذوقِ سلیم پر گراں گذرے یا ادبی معیار سے گری ہوئی ہو۔

آخر میں مکتبہ اردو کی طرف سے ہمیں ہندوستان کے اُن ادبی رسائل کے مدیران کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنکے گرامی قدر ماہناموں کی بدولت ان نظموں کی اشاعت ہوئی اور ہم معذرت چاہتے ہیں کہ اُن سے فرداً فرداً اجازت حاصل نہ کر سکے۔ تاہم ہمیں یہ یقین ہے کہ اس ادبی خدمت کے سلسلے میں ہمیں اُن کی معاونت حاصل ہے اور ان ادبی شہپاروں کی پیشکش میں وہ ہمارے دوش بدوش ہیں۔

لاہور۔ یکم فروری ۱۹۴۳ء

ادارہ

زنجیر

گوشۂ زنجیر میں،
اِک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی
دشمن جاں دشمنِ جاں ہی سہی
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں ریشم نہیں!

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دُور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حُسنِ روز افزوں کی زینت کے لئے

سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تار ہائے سیم و زر
اُن کے مُردوں کے لئے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

شکر ہے دُنبالۂ زنجیر میں،
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگ زاروں سے ندا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سُو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگامِ باد آورد کو
حیلۂ شبخوں بناؤ!

ن۔م۔راشد

میں کون

کبھی غبار کبھی خاکِ راہ میرے لئے
میں یادگار ہوں اپنے جنونِ پیہم کی
مرے جہاں میں فقط میری حسرتوں کے مزار
ترس گئی ہے نظر عورتِ شجر کے لئے
سُراغِ منزل و شورِ دراے کوسوں دُور
رہِ نجات سے بھٹکا ہوا کوئی راہی
میرا خیال تجھے گر نہیں نہ ہو، میں کون

نثار ہیں ترے پیکر پہ چاند کی کرنیں
ردائے نکہتِ گل پردہ دار ہے تیری
مئے شباب سے تر ہونٹ اور نشے میں چور
وہ مست آنکھیں نہاں جن کی نہیں شبنمی خواب
کبھی میانِ گل و نسترن کبھی لب جُو
ہیں عشوہ ساز حسینوں میں محفلیں تیری
مرا خیال تجھے گر نہیں نہ ہو، میں کون!

مسعود پرویز

اندھیر نگری

شادؔ مری نظموں کے کارن امّاں بی دکھ سہتی ہیں
واقف ہیں خاموش فضا میں فکر کی دھاریں بہتی ہیں
دن بھر گھر کے کام کاج میں دور دور ہی رہتی ہیں
لیکن رات کو پوتوں[1] سے روز ایک کہانی کہتی ہیں
جس میں اکثر کسی بادشاہ کی سات بیٹیاں ہوتی ہیں
بادشاہ بیٹے کی خاطر جیتے جی مر لیتا ہے
دوا، دُعا، تعویذ اور گنڈے سبھی جتن کر لیتا ہے
بیگم سے ہر "ملّا" "سیانا" "نذر" پیٹ بھر لیتا ہے
پہلا مُرغ و مُشک دوسرا "گھنٹا"[2] "گوگر"[3] لیتا ہے
قسمت دُور سے ٹھینگا دکھلاتی ہے اُمیدیں روتی ہیں
بادشاہ اِن ساتوں سے کرتا ہے کسی دن کوئی سوال

---

[1] میرے بھتیجے ۔ [2] سوٴر کا بچہ ۔ [3] گوگل

یا یہ حکم کہ لائے کوئی "امرت" اور جائے پاتال
یا دشمن کے ہاتھوں تخت و تاج و حرم سراپا مال
اَدَل بَدَل کر وہی مضامین وہی تخیل وہی مآل
القصہ روز امّاں بی پوتوں کو سُلا کر سوتی ہیں!

مجھ کو یہ یکساں افسانے پہلے پہلے بار ہوئے
پھر آہستہ آہستہ اُس عادت سے دو چار ہوئے
جس کے ہوتے مجھ کو نوبت نقارے بیکار ہوئے
شور و غل سے "قطعِ سماعت"[1] جب چاہا اشعار ہوئے
وہ اشعار کہ جن کی خوشبوئیں کانٹے سے چبھوتی ہیں

آج رات جب دادی کو اُن کے پوتوں نے گھیر لیا
یہ بستر پر چڑھ بیٹھا نکیوں کا اُس نے ڈھیر لیا
ٹھہرو۔ کہہ کر موصوفہ نے "قُتّی" کا رُخ پھیر لیا
کھا کر پان۔ فسانے کا عنوان غضب اندھیر لیا
وہ اندھیر کہ جس کا مُنہ ارواحِ خبیثہ دھوتی ہیں!

بولیں۔ نام کہانی کا ہے "اندھی نگری" "چوپٹ راٹے"[2]

---

[1] قطع نظر کی وضع پر ؛ [2] اندھیر نگری چوپٹ راجہ اندھی نگری چوپٹ راٹے دونوں طرح بولتے ہیں اور شاید موخر الذکر زیادہ صحیح ہے ؛

اِس نگری میں بھولے بسرے ایک گرو دو چیلے آئے
سُنیں صدائیں۔ ٹکے سیر کوئی بھاجی لے کوئی کھاجا کھائے
چیلے اِس من بھاتی ریت پہ ریجھے اور گرو گھبرائے
بولے جلدی بھاگو "موجیں" یاں دریا کو ڈبوتی ہیں
جس بستی میں چلتی "گاڑی"[1] "نقد مال" "کھویا" کہلائے
چال جہاں چنچل گھوڑے کی "سرپٹ"[2] اور "پویا"[3] کہلائے
"خوب کلاں" رائی کا دانہ ہوشیار "سویا"[4] کہلائے
سمجھیں "پاک" جہاں شُہدے کو بدنام "دھویا"[5] کہلائے
اس بستی میں پاپ کی رہیں پُن کا خون بلوتی ہیں!
ان رمزوں نے چیلوں کے ہر دل پر جب تاثیر نہ کی
گرو نے اُن کی ناسمجھی پر ہاتھ ملے تقریر نہ کی
چمٹا۔ لٹیا ڈور اٹھا لی چل نکلے تاخیر نہ کی
چیلوں نے تعمیرِ بدن میں لقمہ بھر تقصیر نہ کی
دُنبوں کی رگ رگ میں غذائیں نشو و نما سموتی ہیں
چارے کی بُو لیتے پھرتے تھے اک دن یہ "دانی سانڈ"

---

[1] کبیر کا مصرع ہے "چلتی کو گاڑی کہیں اور بنے دودھ کو کھویا" (مادا)؛ [2] اندھا؛ [3] پڑیا ہوا؛ [4] ہرسبز ساگ؛ [5] غالب کا مصرع ہے "دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے"۔

کسی سود کے مارے نے کی سُود خوار کی بیوی رانڈ
دوڑے جھپٹے اچھلے کودے بے آئین پولیس کے بھانڈ
دُبلے قاتل سے کترا کر لئے یہ موٹے چیلے ڈانڈ
کاٹھ کا پتلا "منصف" بولا بندھ جائیں سو موتی ہیں

تھی تمہید کہانی کچھ ایسی "کڑوی" دل آویز
جیسے جامِ جہاں نما کے اندر مئے نمک آمیز
جیسے تُرشی کیف و خمارِ حال کو بیداری انگیز
جیسے چلتے پھرتے مُردوں میں احساسِ رُستا خیز
جیسے چھوہاریں موتی سے سوکھے کانٹوں میں پروتی ہیں

میں نے پوچھا، کیوں، ماں بی اب بھی یہ نگری ہے کہ نہیں
جس کی زمینیں اُلٹی گنگا کے سیلاب کو موزوں تھیں
فرمایا، انجان نہیں تم رہنے دو یہ بات یہیں
زیرِ "علم"[1] آسکتا ہے کیا کوئی "اسمِ[2] عام" کہیں
عام ہیں وہ سرکاریں جو "گیہوں" "کیلئے" "جو" بوتی ہیں

شاد عارفی

[1] اسم معرفہ [2] نکرہ

(روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُو سیاہ)

اے کاش! نظر کبھی اِدھر جا سکتی
اے کاش! کبھی سمجھ یہ سمجھا سکتی
جو شخص بُرا بھلا نہیں گا سکتا
اس کو کبھی شاعری نہیں آ سکتی

شاعر بننا ہے تو خوش آوازی سیکھ
اربابِ نشاط کی سی طنّازی سیکھ
اس سے پہلے کہ شعر کہنا سیکھے
جا اور باقاعدہ گلے بازی سیکھ

میں ہی کامل نہ تم، یہ کچھ راز نہیں
دونوں صاحب کمالِ ممتاز نہیں
تم میں یہ کمی کہ شعریت سے محروم
مجھ میں یہ کمی کہ میں گلے باز نہیں

پوشاکِ ترنّمات کڑھتی کیونکر
ندّی موسیقیت کی چڑھتی کیونکر
گر شعر و غنا بہم نہ مل کر بڑھتے
اولاد "تان سین" بڑھتی کیونکر

آزاد انصاری

زُلفیں

بدلی سے ہوا جھگڑ رہی ہَے گویا
بادل کی پری بگڑ رہی ہَے گویا
جنبش میں ہَیں صبا سے زلفیں تیری
تاریک پھوہار پڑ رہی ہَے گویا!

یہ سلسلۂ لامتناہی ہَے کہ زُلف!
گہوارۂ بادِ صُبح گاہی ہَے کہ زُلف
اے مستِ شباب! دوش سیمیں پہ ترے
ڈھلکی ہوئی رات کی سیاہی ہَے کہ زُلف

اللہ ری یہ زُلف! مری مستِ شباب
ہر حلقۂ شب رنگ ہَے گویا گرداب
یا آتشِ رُخ کا ہَے یہ دُود پیچاں
یا رندِ سیہ مست کا الجھا ہوا خواب

جوشؔ ملیح آبادی

وداع

سست راہوں میں بگولے ہیں ابھی گرمِ سفر
آج میں تیرے شبستاں سے چلا جاؤں گا
دور مغرب کے کسی گوشۂ تنہائی میں
جس جگہ شام و سحر بیٹھ کے ستاتے ہیں
اپنی تقدیرِ غمِ بارِ سفر سے تھک کر
اور پھر تازہ نفس ہو کے پلٹ آتے ہیں
کیا خبر میں بھی کسی روز پلٹ ہی آؤں
پر کبھی تازہ نفس ہو بھی سکوں گا کہ نہیں
یہ بھی ممکن ہے کہ میں لوٹ کے آ ہی نہ سکوں
سانس بھر سانس ہے کچھ عمر کی زنجیر نہیں
اور زنجیر بھی ہو گی تو کہاں تک اختر
ٹوٹ جائے گی کسی روز جہانگیر نہیں
روز خورشید دہکتے ہوئے تانبے کی طرح
ایک دلدل کے سمندر میں ڈھلک جاتا ہے
اور اک خون اگلتے ہوئے ساحل کے قریب
چھوڑ جاتا ہے تذبذب میں سلگتی ہوئی شام
کیا خبر پاؤں مرا ساتھ بھی دیں گے کہ نہیں
کیا خبر کیا ہے مرے عزمِ سفر کا انجام
روک آنکھوں سے ابلتا ہوا طوفانِ عظیم

ٹوٹ جائے نہ کہیں مرے تخیل کا حصار

اجنبی دیس کی ویران گذرگاہوں میں
میں اگر پا نہ سکا عشرتِ منزل کا سراغ
لوٹ آؤں گا تصوّر میں تری سمت کبھی
گل نہ ہو جائے کہیں تیرے دریچے کا چراغ

آہ یہ دیدۂ پُر یاس میں اُمید کی سوت
خشک ہوتی بھی نہیں اور ابلتی بھی نہیں

تو مرا نقشِ قدم چشمِ فسردہ سے نہ دیکھ
دیکھ وہ راہ گذر ہانپ رہی ہے ابتک
میں جسے روند کے آیا ہوں باندازِ جنوں
کیا سفر موت ہے تو کانپ رہی ہے ابتک

سبز پتے غمِ امروز کا ماتم نہ کریں
وقت وہ دور ہے جب دورِ خزاں آئیگا

میں مسافر ہوں مجھے تو بھی مسافر ہی سمجھ
یوں خرد سوزِ محبت کے جنازے پہ نہ رو
زندگی مضحکہ انگیز کہانی تو نہیں؟
یہ ملاقات کہیں پردہ اوہام نہ ہو

روز ہم خواب میں اک شیشہ محل کے اندر
خام افکار کے اصنام بٹھا لیتے ہیں

تو حقیقت میں کہیں میرا تصور تو نہیں
زندگی خواب ہے اک خواب حقیقت کم ہے
یا تخیل ہی حقیقت کی حدوں میں گم ہے
یا حقیقت ہی تخیل کے جنوں میں ضم ہے

پیچ در پیچ ہیں اسرارِ رموزِ ہستی
کیا خبر موت کسی اور جہاں کا غم ہو

بہ گیا اوس کی مانند ستاروں کا جمود — دیکھ مشرق کی طرف رات کے آثار نہیں

تیرگی لوٹ گئی اپنا اثاثہ لے کر — زندگی موت ہے گر جذبۂ صدکار نہیں

تو سمجھتا ہے مری ذات کو سامانِ سکوں

میں سمجھتا ہوں تری یاد کو سامانِ حیات

پھر مرا خون مچلتا ہے ارادے بن کر — پھر کوئی منزلِ دشوار بلاتی ہے مجھے

پھر کہیں دشت و جبل ڈھونڈھ رہے ہیں مجھکو — پھر کہیں دور سے آواز سی آتی ہے مجھے

کتنا دلکش ہے دھندلکا سا افق کے نزدیک

آسماں چوم ہی لینے کو ہے تقدیرِ زمیں

آج بس تیرے شبستاں سے چلا جاؤنگا — یہ دکھانا ہے کہ اُمید کا مرکز غم ہے

صرف آنسو ہیں ترے پاس تبسّم بھی نہیں — کیوں تری چشمِ فسوں کار ابھی تک نم ہے

میرا سرمایۂ اُمید اگر لُٹ ہی گیا

آخری سانس تری گود میں آکر لونگا

اختر الایمان

ابدیّت

کنارِ آبِ رواں آج بھی وہی ہے سکوں
جسے نکالا تھا شہروں کے شورِ پیہم نے ——

ہجوم بکھرا ہوا شام کی صداؤں کا!
دروں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا گزرتا ہے
ہوا کے آہنی پنجوں کی برف خوردہ گرفت
اُسے پکڑ کے فضا میں دھکیل دیتی ہے ——
ہنسی کے شعلے لپکتے ہیں سرد سانسوں سے
مگر چراغِ مسرت جلا نہیں سکتے
یہ خود بھی سرد ہیں۔ مایوس و مضطرب سی ہنسی
فسردگی کے دھوئیں میں سمائی جاتی ہے
نگاہیں ملتی ہیں بے اختیار ملتی رہیں!
مگر دلوں میں ترقی ہیں آرزو کی طرح
ربابِ عشق صدا دے کے ٹوٹ جاتا ہے

گلال چہروں پہ رنگِ شفق سے ہے جیسے
کسی نے آگ لگا دی ہو ابر پاروں میں
اُداس، مرثیہ خواں، دلفگار تعمیریں
بجھے ہوئے سے چراغوں کو لے کے بیٹھی ہیں ——
سیاہ پردۂ شب میں چھپی ہوئی آنکھیں
تراشتی ہیں ستاروں کے اَن گِنت آنسو ——
مہیب چیخ جگاتی ہے کارخانوں کو
تو ان کی لمبی بڑی ناک سے دھواں اُٹھ کر
دبوچ لیتا ہے ہاتھوں میں آفتابوں کو ——
تقاضاہائے شرافت سے مسکراتے ہوئے
وہ لوگ جن کے پلندوں سے گرد اڑتی ہے ——
مشین بن کے گھسے جاتے ہیں دفاتر میں ——
یہ مسکراتی ہوئی رونی صورتیں اِن کی
نہ دیکھی جائیں گی —— مجھ سے نہ دیکھی جائیگی
مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو کہ یہاں
حرارتِ ابدی بیچ کر خریدتے ہیں
وہ ایک نانِ جویں جس سے موت ملتی ہے

(۲)

سُنا ہے آج بھی آب رواں کے دھارے پر
وہی سکوں ہے نکالا تھا جس کو شہروں نے
حقیر جان کے بے آبرو سمجھتے ہوئے —
وہیں چلیں — کہ تمہاری نگاہ کی مستی
فضائے دل پہ مسرّت کی چاندنی بن کر
تمہارے ساتھ مجھے لازوال کر دے گی

یوسف ظفر

سائے

یہ سائے، یہ پھیلے پھیلے بکھرے بکھرے سائے   یہ سائے، یہ دھندلے نکھرے نکھرے سائے

گو یہ سائے آج سمجھتے ہیں مجھ کو بیگانہ   لیکن ان سے وابستہ ہے ایک حسیں افسانہ

ان کے نیچے میں نے کاٹیں بھادوں کی دوپہریں   جب رقصاں ہوتی تھیں ہر سو، دھوپ کی تپتی لہریں

جب اک البیلی چرواہی لہراتی آتی تھی   رستوں سے کتراتی جب کھیتوں میں چھپ جاتی تھی

چھپتی چھپتی، جھکتی جھکتی، میرے پاس آتی تھی   ہانپتی ہانپتی، ڈرتی ڈرتی، گھاس پہ گر جاتی تھی

اور جب گھبرا کر کہتی تھی —— "کوئی دیکھ رہا ہے   سامنے کی پگ ڈنڈی پر وہ کالا دھبا کیا ہے

میں ہنس کر کہتا تھا —— پگلی - یہ تو وہم ہے تیرا   کوئی اگر ہو بھی تو یہ رکھا ہے چاقو میرا!"

وہ میرے پہلو میں سمٹ کر چپکے سے یہ کہتی تھی   یہ وادی تجھ سے پہلے دوزخ سا بنی رہتی تھی

"اب تو ذرّے ذرّے میں آباد ہے جنّت میری   تجھ سا بانکا گبھرو پایا —— واہ ری قسمت میری

شام پڑے تو لگ جاتی ہے دل کو دن کی چنتا   کاش کبھی تو شب کو میرے دل کی دھڑکن گنتا

دیکھو گر ما کے جاتے ہی، مجھ کو چھوڑ نہ جانا   مجھ سے آنکھیں موڑ نہ لینا، دل کو توڑ نہ جانا

میں تیری ہوں، مرتے دم تک میں تیری ہوں پیارے

تیرے قدموں میں بیٹھی ہوں، اپنا تن من ہارے

لیکن گرما کے جاتے ہی میں اس کو چھوڑ آیا
اس البیلی چرواہی کا نازک دل توڑ آیا

اب آیا ہوں تو ہر جانب کہرا سا چھایا ہے
اس کا مفلس باپ اُسے پردیس میں بیچنے آیا ہے

اب یہ ٹھنڈے ٹھنڈے سائے آگ میں تپ جاتے ہیں
ایک پرانے ساتھی پر چنگاریاں برساتے ہیں

دھوپ کو رستہ دے دیتے ہیں دامن کو سرکا کر
یوں ہلتے ہیں — ناگ اُٹھتے ہیں جیسے پھن لہرا کر

احمد ندیم قاسمی

نومیدیِ جاوید

تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم
کہ میں وہ سازِ بے نوا ہوں اب
ٹوٹ کر جو خموش ہو جائے
جس کے تاروں میں اب بھی لرزاں ہو
ایک جاں سوز آخری آواز
وہ فضا میں نہ کر سکے پرواز
ساز کے پیچ و خم میں کھو جائے
تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم
کہ وہ سوکھا ہوا شجر ہوں میں
جو ہو تنہا کسی بیاباں میں
آندھیاں جس کو توڑنا چاہیں
نظر آتا ہو جو نحیف و نزار
جس میں باقی رہے نہ حسنِ بہار

جل کے رہ جائے سوزِ پنہاں میں
تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم
کہ وہ بجھتا ہوا دیا ہوں میں
جو ہواؤں کے رہگذار میں ہو
جو ہو مہمان چند لمحوں کا
خوف و اُمید و یاس سے لرزے
زندگی جس سے دُور دُور رہے
موت ہر لمحہ انتظار میں ہو
تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم
چھوڑ دے تو بھی اب مجھے تنہا
چین کی نیند مجھ کو سونے دے
اور مری روح کو دے آزادی
اذنِ پرواز دے فضاؤں میں
وقت کے بیکراں خلاؤں میں
سالہا سال اس کو رونے دے
تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم
راجہ مہدی علی خاں

دوراہا

ریل گاڑی پہ یہ گھمسان ۔ الہٰی توبہ! ـــــ
نہ مروّت، نہ تکلّف، نہ تبسّم، نہ ادا
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش! ـــــ
بے ارادہ ہے تو کیا، غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دور کے احساسِ غلامی کا ظہور
انتقامانہ تحکّم کی نمود! ـــــ
خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اک اظہارِ بغاوت بھی تو ہے
یونہی یونہی سہی
اک شائبہ دادِ شجاعت بھی تو ہے
ـــــ "چاک تو کرتا ہوں میں اپنا گریباں ہی سہی"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

کلبلاتی ہوئی مخلوق کی اس دلدل میں

سینہ تانے ہوئے کچھ لوگ بڑھے جاتے ہیں
خوب پھنکارتے پھن پھیلائے! ـــــ
’لوگ‘، ہم وہ لوگ ...... کالانعام، نہیں
جن کو ٹھکراتے ہوئے جاتے ہیں
یہ لوگ ـــ بڑے صاحب لوگ! ـــــ
یہ جو حکام ہمارے ہیں یہ حکام نہیں
جو ہمیں میں سے ہیں پر ہم میں نہیں۔
یہ جو بندوں کے ہیں آقا مگر آقا کے غلام
ـــ باوفا ہوں تو ہوں بیدام نہیں! ـــــ
"تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا،"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ان پہ دنیا کی ہر اک راہ کشادہ ہے مگر
آج اک سنگِ گراں حائل ہے۔
کہ اُٹھائے نہ اُٹھے اور ہلائے نہ ہلے! ـــــ
دوسرے درجے کے دروازے میں
ان کے آقاؤں کا اک فرد ـــــ فرنگی گورا
باہیں پھیلائے ہوئے راستہ روکے ہے کھڑا۔

"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق!"
سیٹیاں بجنے لگیں! — خدمتِ سرکار بجا لانا ہے
اور سرکار ہی خود سنگِ رہ منزل ہے؟ ——
زندگی آگئی دوراہے پر! —

—— دیر کیوں کرتے ہو بھاگو بھاگو
دو ڑ کر تھرڈ کے ڈربے میں گھسو
اپنے ہم جنس غلاموں میں رلو
زندگی آگئی دوراہے پر! —

ڈاکٹر تاثیر

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری۔
یہ چمکتے ہوئے تارے!
یہ دمکتا ہوا چاند!
بھیک کے نور میں، مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے، یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں ——
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گِدھ
وہ تڑختے ہوئے سر

میّتیں، ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سنّاٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچّوں کی
کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مخدوم محیّ الدین

سعیٔ خام

چاندنی کے ساز پر ہو محبت نغمہ گر
میرے دل کا اہتزاز بن گیا ہے رُوحِ ساز
چاندنی کو لے کے دُور جا رہی ہے موجِ نُور

بھیجتا ہوں تیرے نام
موجِ سیمیں پر پیام
آہ لیکن سعیٔ خام!

جس طرح بچہ کوئی ناؤ اپنی کاغذی
آبجو میں چھوڑ دے اور توقع یہ کرے
ناؤ اُس کی جائیگی اور کھلونے لائیگی
مادرِ مرحوم سے شہرِ نامعلوم سے
پھر کنارِ جوئبار وہ سراپا انتظار
کشتیوں کو دُور سے دُور سے آتے ہوئے

دیکھتا ہوتا بہ شام!!

سعید احمد اعجاز

مہمان

آج کی رات اور باقی ہے

کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے!

زندگی منتظر ہے مُنہ پھاڑے

زندگی خاک و خون میں لتھڑی

آنکھ میں شعلہ ہائے تند لئے

دو گھڑی خود کو شادماں کر لیں   آج کی رات اور باقی ہے

چلنے ہی کو ہے اک سموم ابھی

رقص فرما ہے روحِ بربادی

بربریت کے کاروانوں سے

زلزلے میں ہے سینۂ گیتی

ذوق پنہاں کو کامراں کر لیں   آج کی رات اور باقی ہے

ایک پیمانۂ مئے سرجوش

لطفِ گفتار گرمئ آغوش

بوسے ــــ اس درجہ آتشیں بوسے
پھونک ڈالیں جو میری کشتِ ہوش
روح یخ بستہ ہے تپاں کر لیں   آج کی رات اور باقی ہے
ایک دو اور ساغرِ سرشار
پھر تو ہونا ہی ہے مجھے ہشیار
چھیڑنا ہی ہے سازِ زیست مجھے
آگ برسائیں گے لبِ گفتار
کچھ طبیعت تو ہم رواں کر لیں   آج کی رات اور باقی ہے
پھر کہاں یہ حسین سہانی رات
یہ فراغت ۔ یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ نہاں
کچھ تو تسکینِ شورشِ جذبات
آج کی رات جاوداں کر لیں   آج کی رات اور آج کی رات

اسرار الحق مجاز

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا، جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے!
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اِک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہات تو ہیں
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہات تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں،
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے!

فیض احمد فیض

تصوّر کے دھندلکے ہیں

شام کی راہ پہ چلنے لگے تاروں کے چراغ
اب بھی دھندلے ہیں مگر میرے تصوّر کے نقوش
جیسے پائے نہ کوئی راہِ محبت کا سراغ
سُرخ تحریر پہ جس طرح سے پانی پڑ جائے
نقش جمتا بھی نہیں شکل بدلتی بھی نہیں
ڈوبتی بھی نہیں یہ ناو سنبھلتی بھی نہیں!

سرمئی ابر کے ٹکڑے پہ طلائی تحریر
میز پر جیسے کسی دوست کی دھندلی تصویر
اور وہ دوست جسے غم نے بھلا رکھا ہے
(صرف تخئیل ہے، تخئیل میں کیا رکھا ہے!)

چھو گئے ہاتھ سے میرے ابھی اس شوخ کے ہاتھ

جسم بیدار ہوا جاتا ہے، آنکھیں رنگیں ——

. . . .

(صرف اک وہم ہے اے شوق! نہیں، کوئی نہیں!!

اور یہ کون چلا آتا ہے کمزور و نزار
اس کو تو چھوڑ کے زنداں میں ابھی آیا تھا
اس کا پیغام بھی سلمیٰ کے لئے لایا تھا!
اب تو سلمیٰ نہیں پہنچاؤں یہ پیغام کیسے؟
(چھوڑ سکتی ہے بھلا گردشِ ایام کیسے!)

گھر میں روتے ہوئے بچّوں کی صداؤں کا گداز
دُور پر بھونکتے کتّوں کی پریشان آواز
ہر صدا ذہن میں دھنستی ہی چلی جاتی ہے
نیم روشن کسی گوشے میں جگہ پاتی ہے!

اور باتیں بھی چلی آتی ہیں لے عذر سوال
یہی جینے کی تمنا، یہی مرنے کا خیال

اُن کے وعدے کی خوشی، ان کے نہ آنے کا ملال

کتنے غمناک و طرب ناک خیال آتے ہیں
اور پھر وقت کی آغوش میں سو جاتے ہیں
ہو گی فرصت تو کسی رات کی تاریکی میں
انہیں چھیڑوں گا کہ یہ روح کو گرماتے ہیں

وہ بگل جنگ کے بجنے لگے، اب جاتا ہوں
خود کو اک اور ہی جادے پہ رواں پاتا ہوں
پھر ہے میدانِ عمل سامنے مسرور ہوں میں
اب خیالات کی دنیا سے بہت دور ہوں میں

احتشام حسین

اندیشہ

آرٹسٹ! اپنی یہ تصویر مکمل کر لے
ہاں، یہ ہونٹ اور بھی پتلے ہوں، یہ آنکھ اور بھی مست!
لیکن اِن گالوں کی سرخی کو ذرا کم کر دے
میں نے شاید انہیں مرجھایا ہُوا پایا ہے
ہلکے اشکوں سے ان آنکھوں کو ذرا نم کر دے
میں نے افسردہ نگاہوں سے یہی سمجھا ہے
آج بھی میں نے سرِ راہ اُسے دیکھا ہے
ایک شہ کار اسے جلد بنا لے اے دوست!
ورنہ تصویر کا خاکہ ہی بدلنا ہوگا ———!!!

سلام مچھلی شہری

بیزار نگاہیں

اپنے بھیگے ہوئے رخساروں کو اک آہ کیساتھ
میرے جلتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ رکھے گا کوئی

لبِ رنگیں کی خموشی پہ نہ میں بگڑوں گا
میری بے باک نوائی پہ نہ روٹھے گا کوئی

دِل نازک کے دھڑکنے کی سنوں گا نہ صدا
میری گھٹتی ہوئی آہوں پہ نہ چونکے گا کوئی

میری آہٹ پہ لجاتے ہوئے میری جانب
ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے نہ آئے گا کوئی

اُن کے ماتھے پہ پڑے گی نہ بناوٹ کی شکن
ان کے کھنچتے ہوئے ہاتھوں کو نہ چومے گا کوئی

میری وحشت کے تماشے نہ انہیں ہونگے نصیب
انکے اُلجھے ہوئے بالوں سے نہ اُلجھے گا کوئی

جن سے آجاتا تھا معصوم نگاہوں میں غرور
میری بے ربط سی ان باتوں کو نہ ترسے گا کوئی

دِل ناشاد! تری چپ سے مگر کیا ہوگا!
تیری فریاد بھی سمجھ ہے نہ سمجھے گا کوئی

میں نے جانا تھا کہ اس وقت بڑھا ہے جو یہ ہاتھ
اب مرے ہاتھوں سے یہ ہاتھ نہ کھینچے گا کوئی

میں تو سمجھا تھا کہ تا حشر رہے گا اب ساتھ
میں تو یوں خوش تھا کہ اب ساتھ نہ چھوڑیگا کوئی

فکر ہی کیا جو کسی کو نہیں پروا میری
کیا مجھے غم جو مرا حال نہ پوچھے گا کوئی

اُن کے امڈے ہوئے اشکوں سے مجھے کیا مطلب
میرے بہتے ہوئے آنسو جو نہ پونچھے گا کوئی

وہ جو خوددار ہیں، خوددار ہیں اے غمِ دِل اُن سے کہدو کہ تمہیں یوں تو نہ چاہے گا کوئی

دِل ناشاد! یہ پھر عرض وفا کی خواہش تیری باتوں کو نہ مانے گا، نہ مانے گا کوئی

اب تو بھولے سے بھی اے دل نہ وہاں جاؤنگا ہائے اُن خاص نگاہوں سے نہ دیکھے گا کوئی

ڈوبتے چاند کی سوگند، نہ جاؤنگا وہاں! میری بے خواب نگاہوں کو نہ سمجھے گا کوئی

میں نہ جاؤں گا، نہ جاؤنگا وہاں اے شبِ غم اک سسکتے ہوئے دل سے تو نہ کھیلے گا کوئی

اُن سے بیزار ہیں جذبی جو نگاہیں میری
اور تاریک ہوئی جاتی ہیں راہیں میری

معین احسن جذبی

رخصت

ہاں، یہ مانا کہ بہت دور تھا لیکن اکثر
سوچتے سوچتے ہی راستہ کٹ جاتا تھا
شہر کے قرب و جوار
گویا اک آنکھ جھپکتے میں نہاں ہوتے تھے،
سامنے مجھ کو نظر آتا تھا۔
ایک ویران محل:
یونہی بے دھیانی میں چوکھٹ بھی نکل جاتی تھی،
وہی چوکھٹ جسے لاکھوں پاؤں
(ہاتھ کے بل پہ ہمیشہ چھپ کر)
روندتے روندتے اس حال پہ لے آئے تھے:
ٹوٹے دروازے کے سب نقش و نگار
کچھ تو بوسیدہ تھے اور باقی مری آنکھوں کو
اتفاقاً ہی نظر آئے تھے،

جیسے چلتے ہوئے ــــ رستے میں پھسل کر کوئی
بے چلے راہ سے کچھ دور نکل آتا ہے
میں بھی دروازے سے، چوکھٹ سے گذر جاتا تھا،
جیسے ساون میں کسی ڈال پہ کوئی گرگٹ
دیکھتے دیکھتے میں رنگ بدل جاتا ہے
ایک ہی وقت میں، اک لمحے میں
یونہی ایوان بھی لیٹا ہوا، بیٹھا ہوا استادہ نظر آتا تھا'
راہ تکتے ہوئے، چپ چاپ ــــ نگاہیں اس کی
مجھ کو بے رنگ جھروکوں سے نکلتی ہوئی کرنوں کی طرح
بھولی یادوں سے ملا دیتی تھیں ــــ
بھولی یادیں جو پھسلتے ہوئے ملبوس کی مانند نئی باتوں کو لے آتی ہیں،
کبھی للچاتی ہوئی اور کبھی شرماتے ہوئے قلب کو گرماتی ہوئی،
آپ ہی آپ میں بہتے ہوئے دھارے کی طرح
اپنے پاؤں کو بڑھا لیتا تھا۔
آپ ہی آپ میں رِستی ہوئی بوندوں کی طرح
سوچتے سوچتے رُک جاتا تھا۔
آپ ہی آپ اُبلتی ہوئی چشمِ نمناک

یاد کے دامنِ بوسیدہ سے
خشک ہونے کے لئے پل کو لپٹ جاتی تھی۔
آپ ہی آپ میں اڑتے ہوئے طائر کی طرح
بہتے بہتے کسی ٹہنی پہ بسیرا لے کر
جھولتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی پھیلی ہوئی، بے جان زمیں کے اوپر
اپنی ہستی کو گرا دیتا تھا،
اور گرتے ہی نظر آتا تھا
ایک ویران محل
جس کی چوکھٹ کو مرے ہاتھوں کے ناخن ہر دم
چھیلنے کے لئے بے تاب رہا کرتے ہیں۔
جیسے یوں چھیلنے سے منظرِ بوسیدہ پر
کچھ نئے نقش ابھر آئیں گے۔

اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے،
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی؟
آپ ہی آپ کلی کھلتی ہے
اُس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے۔

آپ ہی آپ زمیں ہلتی ہے
اُس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے،
آپ ہی آپ گھٹا چھاتی ہے۔
آسماں صاف نظر آتا ہی نہیں؟
آپ ہی آپ چلی آتی ہے آندھی
اور پھر منظرِ بوسیدہ ابھر آتا ہے،
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی؟
اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے،
آپ ہی آپ میں شرمندہ ہوا کرتا ہوں۔

میراجی

دائرے

دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِ نظر
اجلے اجلے، دھندلے دھندلے مٹتے مٹتے دائرے

کون سے نقطے سے ہے آغاز ان کا کیا خبر
اور کہاں انجام ہے یہ بات بھی پوشیدہ ہے

دائرے ہیں یہ کہ زنجیریں تخیّل کے لئے
فکر کو پابند کرنے میں جو ہیں ناکامیاب
دائرے ہیں یہ کہ سیمیں جال ہیں پھیلے ہوئے
طائرِ ادراک جن سے اڑ رہا ہے دور دور

دائرے ـــــ روشن کہیں دھندلے کہیں اوجھل کہیں
جیسے ماضی کے دھندلکوں میں نمایاں ہو کبھی

یاد اُن بھولے ہوئے بسرے ہوئے احباب کی
گردشِ دَورِ زماں نے آج پھینکا ہے جنہیں
دُور آنکھوں سے، تمنّا کی رسائی سے پرے

دائرے تابندہ و رخشندہ و بے نور سے
ہاں یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر

دائرے اُلجھے ہوئے باہم ــــ سمٹتے پھیلتے
تیز رفتار ان میں کوئی اور کوئی سُست رو
پھر بھی سب باہم رواں انداز ہم آہنگ سے
ابتدا اور انتہا کی قید سے آزاد ہیں
چشمِ بینا کو گماں ہوتا ہے اُن کو دیکھ کر

دائرے جن کے تسلسل کا سرا نایاب ہے
بس یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر

جگن ناتھ آزاد

ساون کا سپنا

یک بیک شور اُٹھے ساون کا
اور کھل جائیں دریچے کے کواڑ
تند بدمست ہوا ——
اپنے ہمراہ لئے
ماندرخشندگیٔ مہتاب کا بھیگا ہوا نور
لڑکھڑاتی ہوئی آئے
دُور تک شہر کے خوابیدہ مکان
اور پھر پیڑوں سے بھی کچھ آگے
تیرہ وتار گھٹا، غول بیاباں کی طرح
بال کھولے ہوئے بڑھتی ہی چلی آتی ہو
آن کی آن میں ہر سمت فضا پر چھا جائیں
غول ——
غول، سیاہ تیرہ وتار

قہقہہ بن کے اٹھے برق "یہ اُجڑی بستی،
جس میں خوابیدہ غلامی کے نشاں ہیں اب تک
پھونک دو اس خس وخاشاک کو ہم ناچیں گے"
وجد میں گونج لرزتی ہوئی نقاروں کی
تیرگی اور لپکتا ہوا نور
غول کے غول فضا میں رقصاں
جاترنگ اور دہل اور طنبور
ساتھ بجتے ہوئے، اور شہر پہ بارش کا نزول
اور ہر سمت یہی شور کہ "آؤ ناچیں! — آؤ ناچیں"
اور پازیب کی جھنکار کے ساتھ
کیف میں جھوم کے تو اُٹھے —— دمکتا ہوا عریاں پیکر
برق و باراں سے ہم آہنگ تھرکتے ہوئے پاؤں
اَن گنت لہروں میں انگڑائیاں لیتا ہوا حسن!

مسعود پرویز

تالاب

گھنے پیڑوں کے سایوں کی قطاروں میں چمکتا ہے
پرانے، بدنما تالاب کا سڑتا ہوا پانی!
ہزاروں سال سے جکڑی ہوئی تخئیل کی صورت
تعفن جس میں بھر جاتا ہے صدیوں کی غلامی سے
کنارے پر سے کچھ اکھڑی ہوئی اینٹوں کی درزوں میں
پھدکتے پھر رہے ہیں کیچڑ میں لت پت زرد رو مینڈک
جوؤں کا رقص جیسے چیتھڑوں میں اک بھکاری کے
پھٹے، بدبو بھرے کپڑوں کو جو رازق سمجھتا ہے
چمکتا ہے سڑے تالاب کا سڑتا ہوا پانی
جمی ہیں جا بجا بدرنگ کائی کی تہیں جس پر
ہزاروں گندے کیڑے پا رہے ہیں پرورش جس میں
میں اکثر سوچتا ہوں اور پہروں سوچتا ہوں میں
مرا مجبور و مفلس ذہن بھی تالاب ہے جس میں

خیالوں کی نجاست سے بھرے اجرام پلتے ہیں!

ابھی کل ہی کا قصّہ ہے کہ اک نادار دوشیزہ
سڑے تالاب کی سخت اور گندی کھال کی میلی
پھٹے کپڑوں میں لپٹی میل سی چکٹی، نزاکت سے
لگی ہنس ہنس کے میرے پاس آکر ہاتھ پھیلانے
ادھر وہ رحم کی طالب، ادھر میں سوچ میں گم تھا
بُری کیا ہے ـــ اگر اک رات اس کے ساتھ کٹ جائے

گھنے پیڑوں کے سایوں کی قطاروں میں چمکتا ہے
پُرانے، بدنما تالاب کا سڑتا ہوا پانی
ہزاروں سال سے جکڑی ہوئی تخیّل کی صورت
تعفّن جس میں بھر جاتا ہے صدیوں کی غلامی سے

مخمور جالندھری

رُسوائی

"ٹیکا لگاؤں، مانگ بھی صندل سے بھر چکوں

کنگھی کروں تو چڑھتی ہے کالوں کی اور لہر — افشاں ہے بخت بھی کہ رہا ان کے پھیر میں

دلہن بنوں تو چاہیئے جوڑا سہاگ کا — مہندی رچے گی پوروں کہیں جا کے دیر میں

کہتی ہے سانجھ، بھور کے اب گھاٹ اتر چکوں

تم بیٹھو — میں تو آئی پہ جی سے گزر چکوں

اتنے دنوں تو دل کی لگی نے خدائی کی!

پائل بجے تو بنسی کی دھن ناچ ناچ اُٹھے — بدنامیاں کرشمے مرے دیوتا کے ہیں

دیدے گھما گھما کے کہیں کیوں نہ گوپیاں — اِن کے چلن تو بگڑے ہوئے ابتدا کے ہیں

بپتا نہ ہو گی کل سے لگائی بجھائی کی

دیکھے شفق، تو دیکھے چتا جگ ہنسائی کی!

چیخیں سن سن کے سبھی نیند کے ماتے جاگے

سامنے دہکی ہوئی آگ کا ہیکر دیکھا — چل کے دو چار قدم پھر سے پلٹ کر جولاں
چیخیں شعلوں کے بھڑکنے پہ لپک اٹھتی تھیں — دود کے حلقے رواں سوئے فلک چرخ زناں
سب یہ سمجھے کہ کوئی غول بیابانی ہے — یونہی لوکا جو لگانے کو نکل آئی یہاں!
بادیا آگ تھی یا لال رسیلی ساڑی — چھایا کالوں کی تھی شعلوں کی زبانوں کا دھواں

یک بیک کندنی باہیں سی اٹھیں چیخ کیساتھ
کانپتے آئے نظر پھول سے مہندی بھرے ہاتھ

ایک نے بڑھ کے وہیں جل کا انڈیلا تسلا — آگ یوں پانی کی شرمائے تو دوزخ نہ بنے؟
جیتے جی اشک سے کیا دل کی لگی بجھتی تھی؟ — آگ پانی میں لڑائی جو چتا پر بھی ٹھنے!
دھول ڈالی، تو ہوئیں پھر کہیں مدھم آنچیں — بخت رسوا ہو تو رسوائی بنا کیسے مٹے!

پوچھو جلنے کی — تو جانے وہی جس تن لاگے"
چیخیں سن سن کے سبھی نیند کے ماتے جاگے

مختار صدیقی

گلاب

کیا بُھلا دیا تو نے

وہ گلاب کا پودا
اک گروہ پھولوں کا
زیبِ گوشۂ بستاں

اک حسیں دلہن گویا
موتیوں سے پر جس کا
سبز مخملیں داماں

جس کی اوٹ میں اکثر
باندھتے تھے ہنس ہنس کر
عمر بھر کے ہم پیماں

آہ! وہ ملاقاتیں
شہد سی تیری باتیں
تتلیاں مرے ارماں

لیکن آج وہ پودا
میں نے اس طرح دیکھا
شاخ شاخ تھی ویراں
سبزہ زار تھے سُونے
کیا بھلا دیا تُو نے

سید ضیا جالندھری

ساقی

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج میخانے کا دروازہ
ہر اک میکش یکایک بے پیئے برہم اُٹھا ساقی
یہ کیسا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز سے اک نالۂ ماتم اُٹھا ساقی
ہوائے زہر آگیں چل اٹھی شاید گلستاں میں
یہ پیمانے اُلٹ ساقی یہ جامِ جم اٹھا ساقی
اگر ممکن ہو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
اُٹھا اور خون میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

جاں نثار اختر (علیگ)

آخری سجدہ

مری زندگی ترے ساتھ تھی، مری زندگی ترے بات تھی
مری روح میں ترا نور تھا، مرے ہونٹ پر تری بات تھی
مرے قلب میں ترا عکس تھا۔ مری سانس میں تری باس تھی
ترے بس میں میرا شباب تھا۔ مری آس بھی ترے پاس تھی
ترے گیت گاتی تھی جب بھی میں مجھے چھیڑتی تھی سہیلیاں
مگر اُن پہ کھل نہ سکیں کبھی مری زندگی کی پہیلیاں
میں ترے جمال میں محو تھی میں ترے خیال میں مست تھی
مجھے کیا سمجھتیں وہ لڑکیاں کہ میں اپنے حال میں مست تھی
تری شان میں مری شان تھی ترا دبدبہ مرا ناز تھا
تری دلبری مری جان تھی تری عاشقی مرا راز تھا
مگر اب شباب گزر گیا تو ترا نیاز بھی مر گیا!
مرے رُخ پہ جھرّیاں دیکھ کر تو پلٹ کے جانے کدھر گیا
میں تری تلاش کروں، مگر، مرا پستیوں میں مقام ہے

تو امیر ہے تو بلند ہے تو فلک پہ محوِ خرام ہے
اگر ایک پل کے لئے کبھی تو بلندیوں سے اُتر سکے

مرے اجڑے پجڑے دیار سے اگر ایک بار گزر سکے
تو مرے خلوص کا واسطہ، مری آرزو، مری آس، آ

مری بات سُن، مری بات سُن، مرے پاس آ، مرے پاس آ
نہ طلب کروں گی کرم ترا کوئی دوش بھی نہ دھروں گی میں

ترے پائے ناز پہ سر رگڑ کے بس ایک سجدہ کروں گی میں

احمد ندیم قاسمی

ولولے

آسماں پہ چھا رہی ہیں بدلیاں
کاکلوں کی طرح لہراتی ہوئی
راگ میں ڈوبی ہوئی پرچھائیاں
آنچلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
چھا رہی ہیں جھومتی، گاتی ہوئی

(۲)

خون کھولا جا رہا ہے کیا کروں؟
پیچ وخم کھاتا ہوا نیلا دھواں
روح پر منڈلا رہا ہے کیا کروں؟
ولولوں کے ساز پر دل ہیں نہاں!
کوئی پیہم گا رہا ہے کیا کروں؟
گا رہا ہے گیت بے چنگ و نوا
جس طرح زلفوں کو پھیلائے کوئی

جس طرح چپکے سے آجائے کوئی
جیسے آنکھوں کو نظر آئے کوئی

ایسے ہی کانوں میں آتی ہے صدا
جیسے لہراتی ہو لہروں پر ہوا
اور یوں محسوس ہوتا ہے مجھے کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے
ہر طرف ہے ایک محرابوں کا جال
دُور تک پھیلا ہوا اک سلسلہ
جس طرح صحرا میں کوئی قافلہ
چھوڑ جاتا ہے نقوشِ پائمال!

(۳)

اس طرح محسوس ہوتا ہے مجھے کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے
ہانپتی لہریں ہیں دل کے آس پاس
گھومتے گرداب میرے پاس پاس
دائرے پھیلے ہوئے ہیں دُور تک جس طرح لَو دوڑتی ہے نور تک
حل ہوا جاتا ہوں میں گرداب میں
جل رہا ہے دل کے ایوانوں میں عُود
گیت ہیں یوں ذہن کے سیلاب میں

جس طرح گاتا ہو کوئی خواب میں
بے صدا، بے لفظ، بے ساز و سرود

(۴)

رفتہ رفتہ ولولوں کا کارواں!
چھوڑتا جاتا ہے قدموں کے نشاں
راستے کے پیچ و خم کے ساتھ ساتھ
جھومتا جاتا ہے صحرا کا غبار
ہر قدم پر، ہر قدم کے ساتھ ساتھ
جس طرح ناچے کوئی دیوانہ وار
نغمہ ہائے زیر و بم کے ساتھ ساتھ

یوسف ظفرؔ

(سولھویں صدی کی ایک فرانسیسی نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

بجتا ہو کہیں باجا، جاڑوں کی مہاوٹ ہیں!
اس وقت اگر آؤ تم ہلکی سی آہٹ میں
دزدیدہ تبسّم کے جادو کو جگاؤں گا
مخصوص ترنّم سے اک نظم سناؤں گا،
تاریک شبِ سرما ہو مست جسے سُن کر
اور ابر بھی پھٹ جائے اُس گیت پہ سر دھن کر
وہ بادلوں کی یورش ہو جائے جو یوں برہم
اور پھول جھڑیں تاروں سے، چاند ہنسے یک دم
تب دیکھ کے یہ منظر تم کہنے لگو، "یہ کیا!؟"

اک دوسرا گانا تب ——————— جو دُکھ سے بھرا ہو گا
آہستہ سے گاؤں گا ——————— پہلے نہ سُنا ہو گا

بادل میں گرج ہو گی اُس گیت کے گاتے ہی
برسے گی گھٹا گھم گھم، وہ گیت سُناتے ہی
بارش کی جھڑی اُس دم اشکوں کی جھڑی ہو گی
جوگن سی بنی دُنیا خاموش کھڑی ہو گی
ٹکرائے گا جب نغمہ اس رات کی آہوں سے
تب دیکھ کے تم مجھ کو مخصوص نگاہوں سے
دہراؤ گے حیرت سے گھبرا کے وہی، "یہ کیا!؟"

مقبول حسین احمد پوری

سات رنگ

تصویر وہ بناؤں کہ مسحور ہو سکوں ایسے خطوط کھینچوں کہ مغرور ہو سکوں

(۱)

اک نوجواں کو شہر میں تشویشِ روزگار
اور دور ایک گاؤں میں برسات کی بہار ہاتھوں میں اک حسینہ کے ٹوٹا ہوا ستار

(۲)

دریا سے ہٹ کے سامنے چھوٹا سا ایک گاؤں
پگڈنڈیوں سے دور، وہاں پیپلوں کی چھاؤں یہ دھندلی دھندلی صورتیں، یہ میلے میلے پاؤں

(۳)

موجوں کے رُخ پہ چھوٹی سی کشتی رواں دواں
دریا کے اس بہاؤ سے ملّاح بدگماں ساحل کے ایک جھونپڑے میں موت کا سماں

(۴)

کچھ لوگ محوِ سیرِ چمن زارِ شالامار
ہنستا ہے سامراج کی دولت کا شاہکار پھاٹک پہ ہٹ کے، میلے فقیروں کی اک قطار

(۵)

سونے کا ماہتاب مناروں کے درمیاں

چاندی کا آفتاب چناروں کے درمیاں　　اور اکؔ خدا" فضائی نظاروں کے درمیاں

(۶)

زنداں کی ایک شمع پہ پروانے مضطرب

اور اپنی اپنی فکر میں دیوانے مضطرب　　باہر حیاتِ تازہ کے افسانے مضطرب

(۷)

سڑکوں پہ انقلاب کی گونجی ہوئی صدا

کالج کے ایک ہال میں دنیا پہ تبصرا　　اک نوجواں کے ہاتھ میں اخبار آج کا

موضوع اتنے، جیسے کہ گھبرا رہا ہوں میں

شاید کہ اپنی فکر پہ خود چھا رہا ہوں میں

سلام مچھلی شہری

طوائف

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگیٔ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلوّن سے مگر
تو نے اس دیدۂ پرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجکو
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجکو
اور یہ زرد سے رخسار، یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار، مری عرضِ وفا سے بیزار

معین احسن جذبی

زندگی کے دروازے پر

پا برہنہ و سراسیمہ سا اک جمِ غفیر
اپنے ہاتھوں میں لئے مشعلِ بے شعلہ و دود
مضطرب ہو کے گھروندوں سے نکل آیا ہے
جیسے اب توڑ ہی ڈالیگا یہ صدیوں کا جمود!

اِن ہپوٹوں میں یہ پتھرائی ہوئی سی آنکھیں
جن میں فردا کا کوئی خواب اجاگر ہی نہیں
کیسے ڈھونڈینگی درِ زیست کہاں ڈھونڈینگی؟
اُن کو وہ تشنگیٔ شوق میسّر ہی نہیں

جیسے صدیوں کے چٹانوں پہ تراشے ہوئے بُت
ایک ناکارہ مصوّر کی طبیعت کا اُبال
ناچتے ناچتے غاروں سے نکل آتے ہوں
اور واپس نہیں غاروں میں ہو جانیکا خیال!

زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
اور یہ رقصِ طلسمانہ کے رنگیں سائے
اس کی نظروں کو دئے جاتے ہیں پیہم دھوکا
جیسے بس آنکھ جھپکنے میں وہ اڑ کر آئے !

شہپرِ موت کبھی غولِ بیاباں کی طرح
قہقہے بھرتا ہے خاموش فضاؤں میں صدا
اپنے پرتول کے اک بار سمٹ جاتی ہے
ایک تاریک سا پردہ یونہی آویزاں رہا

کوئی دروازے پہ دستک ہے، نہ قدموں کا سراغ
بند تھے بند ہیں اب تک یونہی قفلوں کے دہن
اور اس گوشۂ زنجیر میں جنبش نہ ہوئی
جس کے سائے میں لرزتے ہیں کئی چاند گہن !

ناچار رہتا ہے دروازے کے باہر یہ ہجوم
اپنے ہاتھوں میں لئے مشعلِ بے شعلہ و دود
زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
کیا خبر توڑ ہی دے بڑھ کے کوئی قفلِ جمود !

اخترالایمان

تفاوتِ راہ

ایک وہ دِن تھا مجھے قرب کا احساس نہ تھا
ایک یہ دن ہے کہ میں بُعد کو بھی جان گئی
آج اِس گذرے ہوئے وقت کا کیا ذکر کروں
اپنے اشعار کا مسجود سمجھتی تھی تجھے
تیری آنکھوں میں نظر آتی تھی جنت مجھ کو۔
اُن دریچوں کے لرزتے ہوئے پردوں کے قریں
جسم کے ساتھ مری روح بھی بے چین رہا کرتی تھی
یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ نگاہوں کا فسوں

ایک لمحہ کے لئے بھی میں سکوں پا نہ سکی
تو مرے پاس تھا میں پھر بھی مٹی جاتی تھی
میری جانکاہ پریشانی کا قصہ مت پوچھ

ہجر کے دھندلے تصوّر کے بھڑکتے شعلے
مجھ کو آغوش میں لینے کے لئے بڑھتے تھے
آج اُن لمحوں کو بیتے ہوئے مدت گذری
تیری تصویر ——— اُسی عہدِ تمنا کی یاد
جو مرے دل کے نہاں خانے میں آویزاں تھی
وقت کے خون میں ڈوبے ہوئے چنگیزی ہاتھ
یوں جھپٹتے رہے اُس پر کہ وہ بچ ہی نہ سکی
اور اب باقی ہے اک عکس ——— بس اک دھندلا سا عکس
دیکھ کر جس کو میں بے چین رہا کرتی ہوں

ایک وہ دن تھا مجھے قرب کا احساس نہ تھا
ایک یہ دن ہے کہ میں بُعد کو بھی جان گئی
اب بھی بے چین ہوں اس وقت بھی بے چین تھی میں
دونوں وقتوں میں کوئی فرق نہیں میرے لئے!

سعیدہ بیگم[1]

[1] (ادبی دنیا کے شمارہ بابت جنوری ۱۹۴۳ء میں اس نام کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اس کی بجائے اعجاز بٹالوی صاحبِ نظم قرار دیئے گئے ہیں)

جوانی

تُو نے دیکھا ہے اُسے

جاتے ہوئے ارضِ حجاز
کتنا موزوں تھا جواں قدِ دراز

—— دل میں کھُبا جاتا ہے

تُو نے چاہا ہے اُسے

مصر! ابوالہول جمال
کتنے موزوں تھے اسکے خد و خال

—— درد بڑھا جاتا ہے

تُو نے پایا ہے اُسے

شمعِ شبستانِ فرانس
کس قدر گرم تھا اسکا ہر سانس

—— جسم جلا جاتا ہے

تُو نے روندا ہے اُسے

جنگ! اُٹھا میرا سہاگ
مادرِ گیتی مرے واسطے جاگ

—— وقت اڑا جاتا ہے

قیوم نظر

ساتھی

پھول کی خوشبو ہنستی آئی!
میرے بسیرے کو مہکانے،

میں خوشبو میں، خوشبو مجھ میں
اُس کو میں جانوں! مجھ کو وہ جانے!

مجھ سے چھُو کر مجھ میں بس کر
اس کی بہاریں! اس کے زمانے!

لاکھوں پھولوں کی مہکاریں
رکھتے ہیں گلشن، ویرانے،

مجھ سے الگ ہیں، مجھ سے جدا ہیں
میں بیگانہ! وہ بیگانے!

ان کو بکھیرا، اُن کو اڑایا،
دستِ خزاں نے، موجِ صبا نے!

بھولا بھٹکا، ناداں قطرہ
آنکھوں کی پتلی کو سجانے

آنسو بن کر دوڑا آیا
میری پلکیں اُس کے ٹھکانے

اس کا تھرکنا، اس کا تڑپنا
میرے قصّے، میرے فسانے

اس کی ہستی، میری ہستی
اس کے موتی، میرے خزانے

باقی سارے گوہر پارے،
خاک کے ذرّے، ریت کے دانے

پربت کی اونچی چوٹی سے
دامن پھیلایا جو گھٹا نے،

ٹھنڈی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے
بے خود آوارہ، مستانے،

اپنی ٹھنڈک لے کر آئے،   میری آگ میں گھل مل جانے
اُن کی ہستی کا پیراہن   میری سانس کے تانے بانے
ان کے جھکولے، میری امنگیں   ان کی نوائیں میرے ترانے
باقی سارے طوفانوں کو   جذب کیا پہنائے فضا نے

فطرت کی یہ گوناگونی،   گلشن، بن، وادی ویرانے
کانٹے کلیاں، نور اندھیرا،   انجمنیں، شمعیں، پروانے
لاکھوں شاطر، لاکھوں مہرے   پھیلے ہیں شطرنج کے خانے
جانتا ہوں میں یہ سب کیا ہیں   صہبا سے خالی پیمانے
بھو کی مٹی کو سونپے ہیں   دنیا نے اپنے نذرانے

جس نے میرا دامن تھاما   آیا جو مجھ میں بس جانے،
میرے طوفانوں میں بہنے   میری موجوں میں لہرانے،
میرے سوزِ دل کی لَو سے   اپنے من کی جوت جگانے،
زیست کی پہنائی میں پھیلے،   موت کی گیرائی کو نہ جانے،
اُس کا بربط میرے نغمے،   اس کے گیسو میرے شانے،

میری نظریں، اُس کی دُنیا
میری سانسیں، اس کے زمانے

مجید امجد بی، اے

ایک عورت

سُبک دھانوں کے پیلے کھیت مغرب میں لہکتے ہیں
اور اُس کے مشرقی گوشے میں شیشم کی قطاریں ہیں
شمالی جھاڑیوں میں جنگلی پودے مہکتے ہیں
اور اک جانب کسی چھوٹے سے دریا کی بہاریں ہیں
پُرانے بانس کے دروازے مشرق ہی میں کھلتے ہیں
یہیں اکثر گلابی چڑیاں کچھ گنگناتی ہیں

(۲)

سنا ہے ایک دن شیشم کے ان منحوس پیڑوں سے
کوئی سایا اندھیرے میں سہاگن بن کے آیا تھا
اکیلے، اونچے اونچے، خشک اور مایوس پیڑوں سے
اسی زرد اور پھیکے چاند نے اک گیت گایا تھا
ندی کے اس کنارے پر جہاں کوئی نہیں جاتا
گھڑا بھرنے کی اب بھی نقرئی آواز آتی ہے

(۳)

یہ پیلا دھان میں نے نرم برساتوں میں دیکھا ہے
کوئی ساون کا نغمہ تیتریوں پر رقص کرتا تھا
کوئی بھدّا تخیّل جھاڑیوں میں رنگ بھرتا تھا

۔ تو اِس کے بانس کے دروازے مشرق ہی میں کھلتے ہیں
سُبک دیواریں مٹی کی کئی جانب سے نیچی ہیں

(۴)

ہر اک تہوار میں سجتی ہیں یہ مٹی کی دیواریں
بہت سے شوخ، زرد اور سبز گل بوٹے ابھرتے ہیں
سنائی پڑتی ہیں ہر صبح کو پائل کی جھنکاریں
پس دیوار اب بھی حوصلے مٹ کر سنورتے ہیں

ہر اک برسات میں کھپرے کی چھاجن بدلی جاتی ہے
کرٹے جاڑوں میں باہر ٹٹیاں گنجان ہوتی ہیں

(۵)

سُبک دھانوں کے پیلے کھیت اب بھی تھرتھراتے ہیں
کوئی نغمہ انہیں کے زرو تاروں پر مچلتا ہے
بہت سے جنگلی پودے نئی جھاڑی بساتے ہیں
وہی چھوٹا سا دریا آج بھی نرمی سے چلتا ہے

مگر اِک صبح کو شیشم کے ان منحوس پیڑوں سے
گزرتی ہی چلی جاتی تھی جو صورت وہ پنہاں ہے۔!!؟

سلام مچھلی شہری

اکیلا ستارہ

سکوں ملتا نہیں فکرِ تلاشِ کامرانی سے
فرار آساں نہیں پُر خارِ راہِ زندگانی سے
میں جیتے جی تو اب اس کشمکش سے بچ نہیں سکتا
کہ ذرّہ ریگذاروں میں عطش سے بچ نہیں سکتا

کئی گھنٹے مسلسل بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں میں
نہیں ہے فکر کوئی پھر بھی پیہم سوچتا ہوں میں
رخِ عشرت پہ فکرِ بیوگی معلوم ہوتی ہے
فضائے زندگی میں بے کسی معلوم ہوتی ہے

مرا دل ہی نہیں ساری فضا سنسان ہے گویا
مری حدِّ نظر پر ایک ریگستان ہے گویا
وہاں تارے کا دیپک اس طرح سے ٹمٹماتا ہے
کہ نخلستان جیسے دھوپ کھا کر مسکراتا ہے

مکاں کی تیسری منزل کھلی چھت، شام کا منظر
اکیلا ایک تارا پورب اور اُتر کے کونے پر
نیا محور بنا ہے میری افسردہ نگاہوں کا
یہ شاید قافلہ سالار ہے گم کردہ راہوں کا

نہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ اک دوشیزۂ صحرا ٹھگی ماندی، زمانے بھر کی ٹھکرائی ہوئی، رُسوا
چھپے خود اپنے گھر میں کیا کہیں مامن نہ ملتا ہو ہوا کھانے کو آئی ہو، مگر پتّا نہ ہلتا ہو

وہ دیکھو غارِ تاریکی سے نکلا چاند کا چہرا! وہ بولی چونک کر دوشیزۂ صحرا "ارے یہ کیا؟
یہ کون آتا ہے تنہائی مری برباد کرنے کو؟ مرا دل چاہتا ہے چیخ کر فریاد کرنے کو!"

"مری بربادیوں کا یہ نیا پہلو نہ ہو کوئی، یہ ظالم چاند بھی افسانوی ڈاکو نہ ہو کوئی،
مری بے چارگی میں رنگ بھرنے تو نہیں آتا مجھے کمزور پا کر چھیڑ کرنے تو نہیں آتا"

بنائی تھی زمیں سے دُور میں نے خواب کی دُنیا مگر کیا وہ بھی ہے کچھ ایسے ہی اسباب کی دُنیا
کہ جن سے بھاگ کر میں خواب کی دنیا بساتا ہوں کہ جن کو بھول جاتا ہوں تو دم بھر مسکراتا ہوں

علی جوّاد زیدی

تسلّی

یہ ضروری نہیں ہو تجھ کو بھی الفت مجھ سے
مری چاہت ہی صلہ ہے مری امیدوں کا
کونسا دل ہے نہیں جس میں تمنّا بیتاب
کونسی آنکھ میں حسرت کوئی پوشیدہ نہیں

اپنے محبوب سے ملنے کے لئے صبح کے وقت
بن سنور کر چلی آتی ہیں چمن میں کلیاں
سارا دن راستہ تکتی ہیں کسی مہوش کا
اور پھر شام کو مرجھا کے بکھر جاتی ہیں

چاند اک دیدۂ بے خواب ہے جانے کس کا
رات بھر جس سے ٹپکتے ہیں دھڑکتے آنسو
جو اس امید پہ بہتے ہی چلے جاتے ہیں
کہ کسی دامن رنگیں پہ چمک اٹھیں گے

گوشۂ باغ میں اڑتے ہوئے جلتے جگنو
خاک کے سینۂ سوزاں کے شرارے ہیں تمام
سخت بارش بھی بجھا سکتی نہیں آگ اُن کی
اُن کی قسمت میں ہے بس سوز و تب و تابِ دوام

پھر اگر تُو نہ ہوئی میری تو قسمت میری
غنچۂ شوق ہمیشہ تو نہیں کھلتا ہے
یہ ضروری نہیں ہو تجھ کو بھی اُلفت مجھ سے
میری چاہت ہی صلہ ہے مری امیدوں کا

طالبؔ شیرازی

تنہا راتیں

محرمِ خوابِ محبت مری تنہا راتیں
وہ مرے عشق کی جنّت مری تنہا راتیں

تا بہ ہنگامِ سحر، سلسلۂ راز و نیاز
شانۂ گیسوئے فرقت، مری تنہا راتیں

ہائے وہ عالمِ تنزیلِ پیاماتِ حبیب
معنیٔ عشق کی صورت، مری تنہا راتیں

بوئے محبوب، ہم آغوشِ پیامِ محبوب
خلدِ رنگینیٔ و نکہت، مری تنہا راتیں

آہ وہ حسنِ تصوّر، وہ جمالِ تنہا
غازۂ عارضِ خلوت، مری تنہا راتیں

غمِ دوراں نے جھلک بھی نہیں دیکھی جنکی
وہ امینِ غمِ الفت، مری تنہا راتیں

وسعتِ شوق سے ایک ایک نفس لامحدود
سر بسر جنّتِ فرصت، مری تنہا راتیں

وہ حجاباتِ لطیف اور وہ انوارِ لطیف
وہ لطافت ہی لطافت، مری تنہا راتیں

عشرتِ عشق کے آنچل میں چھپائے ہوئے رُخ
چہرہ افروزِ مسرّت، مری تنہا راتیں

کبھی خاموشیٔ انجم سے حکایت پرواز
اور کبھی خود ہی حکایت، مری تنہا راتیں

اب وہ شب ہائے پُراسرار کہاں سے لاؤں
خواب وہ اے دلِ بیدار کہاں سے لاؤں

روشؔ صدیقی